

## نچ صاحب سوئے ہوئے ہیں!

کیڈٹ کالج حسن ابدال میں گھر سے آئے ہوئے خطوط دو پہر کو ہائل کے شروع میں رکھے ہوئے ڈبے پر پڑے ہوتے تھے۔ پچھلی کے بعد جب اپنے کمروں کی طرف جاتے تھے، تو لازماً ڈبے پر پڑے ہوئے بند لفافوں کو ضرور دیکھتے تھے۔ پانچ سال میں یہ ہر ایک کی عادت سی بن چکی تھی۔ والدہ ہفتہ میں تقریباً دو خلکھلتی تھیں۔ انتہائی خوش خط اور علی گڑھ کی سند یافتہ اردو۔ لفافہ پر لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر سمجھ جاتا تھا کہ یہ خط میری والدہ کا ہے۔ حسب معمول ایک دن ڈبے دیکھنے لگا تو ایک خط پڑا ہوا تھا۔ یہ میری والدہ یعنی پروفیسر صاحبہ کی طرف سے نہیں تھا۔ کھولا تو خط ایک لیٹر پیڈ پر تھا۔ پیشانی پر والدہ کا نام درج تھا۔ راؤ محمد حیات خان انتہائی مختصر تحریر تھی۔ بس بتایا تھا کہ بیٹا میں ایڈیشن سیشن نج بکر ملتان جا چکا ہوں۔ کافی دیریک بار بار الفاظ پڑھتا رہا۔ میرے والدتوکیل تھے۔ پھر یہ سیشن نج کیا ہوتا ہے۔ حقیقت میں مجھے دونوں کے فرق کا کوئی علم نہیں تھا۔ پتہ ہی نہیں تھا کہ نج کیا ہوتا ہے اور وکیل سے کس طرح مختلف ہوتا ہے۔ ویسے آج بھی یہ فرق پتہ نہیں چلا کیونکہ دونوں ہی میں انتہائی محترم پیشے ہیں۔ یہ 1974 کا تذکرہ ہے۔

بچپن میں جب تھوڑی سی ہوش سنبھالی تو پروفیسر صاحبہ کی آواز کے ساتھ ساتھ سب سے منوس آوازنچ صاحب کی تھی۔ یہ 1963 یا 1964 کا لائل پور تھا۔ سادہ سا صنعتی شہر۔ جب نج صاحب نے وکالت شروع کی تو بہت تھوڑے سے عرصے میں وکالت چلنگی۔ پیسہ کی ریل بیل ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں شہر میں گاڑیاں بہت کم تھیں۔ ہمارے پاس سفید رنگ کی بڑی سی کار تھی۔ ویسے ہال۔ اس میں چابی نہیں تھی۔ یعنی وہ چابی سے شارٹ نہیں ہوتی تھی۔ گاڑی کے سامنے ایک سوراخ تھا۔ اس میں لمبا سا سریہ نما ہینڈل پوسٹ کر کے زور سے گھما یا جاتا تھا۔ دو تین مرتبہ ہینڈل گھمانے سے گاڑی سٹارٹ ہو جاتی تھی۔ یہ سارا کام غفارڈ رائیور کے ذمہ تھا۔ بڑے جسم کی وجہ سے گاڑی گھر میں پارک نہیں کی جاتی تھی بلکہ 342 نمبر گھر کے نزدیک ایک بڑے سے کمرے میں کھڑی کی جاتی تھی۔ یہ شائد کرایہ پر لیا گیا تھا۔ 342 نمبر گھر آج بھی جناح کالونی میں موجود ہے۔ جب بھی لائل پور جاتا ہوں تو باہر سے یہ گھر ضرور دیکھتا ہوں۔ یادوں کا ایک دریا موجز ہو جاتا ہے۔ ویسے عرصے سے یہ مکان خالی پڑا ہوا ہے۔ نج صاحب شائد کچھری کے دو تین وکلاء میں سے تھے، جنکے پاس ذاتی گاڑی تھی۔ ویسے اس زمانے میں کسی کو ذاتی گاڑی کا دھیان بھی نہیں تھا۔ سادگی کا دور تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی لوگ تانگوں اور سائیکلوں پر سفر کرتے تھے۔ راؤ صاحب جب کچھری جاتے تھے تو بڑا شاندار سوٹ پہنچتے تھے۔ انتہائی خوش لباس انسان تھے۔ ہر سینر کے شروع میں نئے کوٹ پینٹ سلواتے رہتے تھے۔ ویسے نج بننے کے بعد انکے مالی وسائل کافی حد تک محدود ہو چکے تھے۔ اسکے بعد سال دو سال میں ہی نئے کپڑے بناتے تھے۔ جب ہم کار میں بیٹھ کر کہیں جاتے تھے تو میری چھوٹی بہن نائلہ جواس وقت تین چار برس کی ہو گی، اپنے پیروں میں سے ایک جوتا نکال کر گاڑی سے باہر پھینک دیتی تھی اور دوسرا جوتا پہنچتی تھی۔ والدہ کو اندازہ تھا لہذا غفارڈ رائیور کو ہمیشہ تسبیہ کرتی تھیں کہ جس طرف یہ بچی بیٹھے، اس طرف کا شیشہ بند رکھنا۔ مگر جہاں بھی موقعہ ملتا تھا، چھوٹی بہن ایک جوتا نکال کر سڑک پر پھینک دیتی تھی۔ ویسے بہنیں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ ہمیشہ بے گھر رہتی ہیں۔ جوانی تک

والد کے گھر مہمان اور شادی کے بعد اپنے خاوند کے رحم و کرم پر۔ عجیب سانظام ہے۔ پھر حقیقت یہی ہے۔

چھٹیوں میں لاکل پورا پنے گھر گیا تو والدہ نے بتایا کہ ایک ہفتہ بعد ملتان جانا ہے۔ ٹھیک ایک ہفتہ بعد ہم سارے وہاں پہنچ گئے۔ شائد ڈین پر گئے تھے۔ اچھی طرح یاد نہیں۔ نج صاحب کو سرکاری گھر نہیں ملا تھا۔ ایک سادہ سامان کا جو کچھری کے نزدیک تھا۔ وہاں قیام پذیر ہے۔ وہ جگہ "کوٹلہ تو لے خان" کہلاتی تھی۔ پہلی چیز جو مجھے احساس ہوا، وہ تھی، کہ نج صاحب بہت سادگی سے زندگی گزار رہے ہیں۔ وکالت کے زمانے کا ٹھانٹھ بائٹھ مجھے نظر نہیں آیا۔ یاد ہے کہ وکالت کے دور میں سردیوں میں ہمیشہ گھرے براؤن رنگ کا گاؤں پہنچتے تھے۔ اس میں ریشمی ڈوریاں لگی ہوئی تھیں۔ سلپینگ سوٹ یا گر تے شلوار پر یہ گاؤں بہت پُر رعب نظر آتا تھا۔ گاؤں صرف گھر کے اندر پہنچتے تھے۔ کچھری جاتے ہوئے ہمیشہ سوٹ ہوتا تھا۔ نج بنے کے بعد سردیوں میں گاؤں کبھی نہیں پہنا۔ میری دانست میں انہوں نے نج بنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ محدود زندگی گزاریں گے۔ آخری دم تک یہی حالات رہے۔ ملتان میں باورچی خانہ گھر سے باہر تھا۔ اس میں رفیق نام کا باورچی کھانا بناتا تھا۔ رفیق تین سال تک میرے والد کے ساتھ رہا۔ بذات خود رفیق بھی ایک داستان گو تھا۔ دو پھر کو جب بزرگ گھر میں آرام کرتے تھے، تو رفیق نزدیکی گراوڈ میں جا کر جو ڈوکرائی کرنا شروع کرتا تھا۔ یہ تمام حركتیں اکیلے ہوتی تھیں۔ اسکے مدد مقابل کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر ٹکمیں ہوا میں مارتارہتا تھا۔ یہ شوق بروں لی کی فلمیں دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ رفیق کا خیال تھا کہ پاکستان میں وہ برسی کا واحد نعم البدل ہے بلکہ ناگزیر ہے۔ اسکا خیال یہ بھی تھا کہ پاکستان فلموں کو اسکی اشد ضرورت ہے۔ رفیق اخبار میں صرف اشتہارات کا صفحہ پڑھتا تھا۔ وہاں ہفتہ دو ہفتہ بعد "ضرورت ادا کار" کا ایڈ آتا تھا۔ رفیق باقاعدگی سے اپنی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اور پہلے سے تحریک شدہ خط فوری طور پر بھجواتا تھا۔ اسکا قوی گمان تھا کہ کسی دن خاص اسکے لیے ایک مخصوص اشتہار ضرور آئیگا۔ اس انتظار کو تقریباً چالیس، پنچالیس برس ہو چکے ہیں۔

وکالت کے زمانے کی بات کروں۔ اس زمانے میں وکلاء کے بار کنوسل کے ایکیشن میں راؤ صاحب نے حصہ لیا۔ شام کو نتیجہ آنا شروع ہو گیا۔ گھر میں کالے رنگ کا فون تھا۔ جس کا نمبر 494 تھا۔ ایک رزلٹ میں نے بھی سنا۔ شائد پنڈی کھیپ سے تھا۔ اس وقت بار کنوسل کا حلقة بہت بڑا ہوتا تھا۔ صرف اندازہ کر سکتا ہوں۔ آج کل کے حلقوں سے دس بارہ گناہ و سیع۔ ووٹوں کی تعداد میں نے کاغذ پر لکھ لی کیونکہ نج صاحب گھر سے باہر تھے۔ خیر بار کنوسل کا یہ ایکیشن وہ آرام سے جیت گئے۔ جب نج بنے تو میرے چچا اور اسلام ممبر منتخب ہونے لگے۔ اسلام چچا تنے مقبول آدمی تھے کہ مرتبے وقت تک بار کنوسل کے ممبر رہے۔ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ جوانی میں انتقال کر گئے۔ فیصل آباد میں ایک آپریشن کے دوران انہیں "انیس تھیز یا" ضرورت سے زیادہ دیدیا گیا۔ سرجن کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔ اس سرکاری ڈاکٹر نے اپنی پیشہ ورانہ غفلت سے درجنوں نہیں سینکڑوں گھر بر باد کیے ہیں۔ چچا کی وفات کے بعد اس سرجن نے "آپریشن نوٹس" تک عائب کر دیے۔ اسے شائد خوف یا ڈر تھا۔ میں نے نج صاحب کو چچا اسلام کے انتقال پر مکمل ٹوٹنے ہوئے دیکھا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے نہیں تھے۔ دوست انہیں صبر کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ نج صاحب کی چچا اسلام سے بہت محبت تھی۔ چچا اسلام کی بے وقت موت سے والد صاحب آخر دم تک سنبھل نہیں پائے۔

تین سال ملتان گزارنے کے بعد سرگودھا اور پھر لاہور آگئے۔ لاہور میں شادمان میں چھوٹا سا سرکاری پورشن ملا۔ نج بننے سے پہلے 1968 کی کرولاسترا ہزار روپے میں خریدی تھی۔ مسلسل ہمارے ساتھ ہی چلتی رہی۔ بس بر س استعمال کرنے کے بعد ایک تبادل سینڈ ہینڈ گاڑی خریدی۔ قصور تعینات ہوئے تو میں نے کئی بار دیکھا کہ گاڑی تو گھر میں کھڑی ہے۔ نج صاحب جا چکے ہیں۔ پتہ چلتا تھا کہ وہ بس پر لاہور سے قصور چلے گئے ہیں۔ یہ درجنوں بار نہیں بلکہ ان گنت بار ہوا۔ وہ شخص جس نے والالت میں بے انتہا دولت کیا، نج بننے کے بعد بس میں سفر کرتا تھا۔ اس وقت تک وہ ایڈیشنل سے پورے سیشن نج بن چکے تھے۔ کبھی انگی زبان سے کوئی شکوہ یا گلہ نہیں سنایا۔ اگر پروفیسر صاحب کی تنجواہ نہ ہوتی تو مالی مسائل بڑھ جاتے۔ اس زمانے میں بچے اپنے والدین سے قدرے فاصلے پر ہوتے تھے۔ خصوصاً والد کا ایک خاص رعب بلکہ ڈرسا ہوتا تھا۔ یہ ہمارے گھر میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ ایک اہم بات تھی۔ نج صاحب کے صرف اور صرف چند پرانے دوست تھے۔ چار یا پانچ۔ اسکے علاوہ میں نے اپنے والد کو کسی کے ساتھ ہنستے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مشتاق دھامنا، عاشق بھٹی، انکل رشید، ناصر سونی اور ایک دو مزید لوگ۔ والالت کے زمانے کے دوست آخری دم تک انکے ساتھ رہے۔

چند سال پہلے آج ہی کے دن یعنی گیارہ نومبر کو صبح چھ بجے والدہ کافون آیا۔ پروفیسر صاحب کی آواز میں کمال ٹھہرا دا اور ضبط تھا۔ بڑے صبر سے بتایا کہ نج صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ الائینڈ ہسپیتال کی ایم جینسی میں گئے اور وہاں دل کے دورہ سے باہر نہ انکل پائے۔ خبر سن کر میں برف کی سل سابن گیا۔ انہیں توریٹا رہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں۔ ساٹھ برس اور چند ماہ عمر۔ واقعی علم نہیں کہ لاہور سے گاڑی کس طرح چلا کر فیصل آباد پہنچا۔ مگر پہنچا تو نج صاحب بڑے سکون سے بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اب زندہ نہیں ہیں۔ خیال تھا، میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اٹھ بیٹھیں گے۔ ضرور پوچھیں گے کہ بیٹا کیوں رورہے ہو۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ موت برحق ہے اور ہم تمام لوگ فانی ہیں۔ اب بھی دن میں متعدد بار سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ شاائد نج صاحب کہیں سوئے ہوئے ہیں، یا چلے گئے ہیں۔ ابدی نیند یا کسی ایسے سفر پر جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہی زندگی ہے اور یہی موت ہے۔ پر مسلسل انتظار تور ہتا ہے۔

راو منظر حیات